دیوانِ غنی کشمیری

از جناب سید علی جواد صاحب زیدی

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جون ۱۹۶۶ء کے "بُرھان" میں "دیوانِ غنی کشمیری" پر ڈاکٹر نورالحسن انصاری صاحب کا تبصرہ شائع ہوا اور اُسی مہینے کے "معارف" میں غنی پر میرا تفصیلی مضمون شائع ہونا شروع ہوا۔ اگر انصاری صاحب کا مضمون چند دن اور شائع نہ ہوتا تو اُن کے بہت سے شبہات کی تشفی میرے مضمون ہی سے ہو جاتی، لیکن نہ ممدوح کو اس مضمون کا علم تھا اور نہ مجھے اُن کے شبہات کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مجھے اسی موضوع پر آج بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت آپڑی ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے چند شبہات کا اظہار کرتے ہوئے بعض جگہ الفاظ کے استعمال میں ذرا زیادہ سخاوت سے کام لیا ہے۔ ہمارے یہاں اظہارِ شبہات میں بھی مبالغہ کی روایت سی بن گئی ہے۔ اس لئے اس پر چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔

انصاری صاحب نے ایک شکایت تو یہ کی ہے کہ حوالے تفصیلی نہیں ہیں، اُن کی شکایت بجا ہے، اس کی کمی "کتابیات" کے اضافے سے پوری ہو سکتی تھی۔ وہ اس میں نہیں ہے۔ ناموں وغیرہ کے اشاریوں کی بھی کمی ہے جس کا ذکر انصاری صاحب نے نہیں کیا ہے۔ پروف پڑھنے میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی۔ اِن میں بیشتر باتیں میرے بس میں نہیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ اکیڈمی نے میری درخواست کے باوجود مجھے پروف پڑھنے کو نہیں دئے اور یہ خدمت ایک ایسے بزرگ کے سپرد کر دی جن کا تدوین، ترتیب یا تصحیح سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں بعض فحش غلطیاں رہ گئیں جن سے میں بھی واقف ہوں، لیکن اب یہ "تیر از کمان جستہ" ہے۔ "کتابیات" اور

"اشاریہ" کی ترتیب ضروری ہی نہیں سمجھی گئی۔

"دیوان غنی کشمیری" کی ترتیب کی بھی ایک داستان ہے۔ یہ کام "جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز" نے مکرمی محمد امین داراب صاحب کے سپرد کیا تھا۔ ممدوح خود فارسی کے شاعر اور صاحب نظر ہیں، لیکن ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے کبھی پہلے نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کسی ایک نسخہ کو بنیاد بنائے بغیر، بالکل ہی نئی ترتیب سے اسے مرتب کر لیا۔ اختلافِ نسخ بھی ظاہر نہیں کیا۔ ترتیب کے وقت اگر انھوں نے کوئی نسخہ سامنے رکھا بھی تو نول کشور پریس والا نواں ایڈیشن، جو خود کئی بار ناسائنسی طور پر مرتب ہو چکا ہے اور ذاتی رجحانات کے ماتحت فک و اضافہ کی منزلوں سے بار بار گزر چکا ہے۔ داراب صاحب نے ایک مقدمہ بھی لکھا تھا۔ بعد میں مقدمہ لکھنے کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ میں نے حالات وغیرہ مرتب کئے اور کلامِ غنی کا تفصیلی جائزہ لینے لگا تو بات ڈھائی تین سو صفحات پر پھیل گئی، جس کا دیوان میں شامل کرنا نامناسب تھا۔ پھر اکیڈمی نے یہ طے کیا کہ ایک مختصر مقدمہ لکھا جائے۔ یہ وہی مقدمہ ہے جو شاملِ کتاب ہے۔ ترتیب میں احتیاط کی جو کمی ہے اُس سے میں خود واقف ہوں اور میں نے مقدمہ میں اس کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے۔ لیکن جس منزل پر یہ دیوان میرے سامنے مکمل ہو کر آیا، ترتیب کا بدلنا میرے بس میں نہیں تھا۔ حواشی کے مرتب کرنے کا کام میں نے (اکیڈمی کے اصرار کے بغیر) صرف یہ سوچ کر کیا کہ اس کے بغیر دیوان کی اشاعت ہی بے معنی ہو جاتی۔ ترتیب کی بنیادی ہیئت بدل جانے سے حواشی کا کام بھی بہت مشکل ہو گیا۔ اس میں کوئی دو ڈھائی برس لگ گئے اور پھر بھی وہ کجی باقی رہ گئی جو خشتِ اول رکھتے وقت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ خامیوں کا جواز تو نہیں ہے۔ لیکن اُن کا تاریخی پس منظر ضرور ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے ایک عنوان "تضادات" کا قائم کیا ہے۔ اس ضمن میں اُن کا بیان بھی کسی قدر متضاد نظر آتا ہے۔ ممدوح نے آغاز میں لکھا ہے کہ "جہاں تک غنی کے سوانح کا تعلق ہے وہ حصہ...... متضاد بیانات سے پُر ہے۔" آگے چل کر شاید انھوں نے اس بیان اور لہجے کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں یہ ترمیم کی ہے کہ "فاضل مقدمہ نگار کے قلم سے "بعض" متضاد بیانات بھی نکلے ہیں۔" "بعض" اور "پُر" میں جو تضاد ہے وہ ظاہر ہے۔

اس سلسلے میں لائق مضمون نگار نے سب سے پہلے صائب کی آمد کشمیر کے سال کے اختلاف کی طرف اشارہ

کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ۱۸ محرم الحرام ۱۰۴۲ھ کو ظفر خان احسن وزارت کشمیر پر فائز ہوئے اور وادی میں آئے۔ اور اپنے ساتھ صائب کو بھی لیتے آئے۔ یہ سنہ "مقدمہ" میں ایک جگہ نہیں دو جگہ درج ہے۔ غلطی سے دوہی جگہ ۱۰۴۱ھ بھی لکھ گیا ہے جو واضح طور پر کتابت کی غلطی اور نظر کی چوک ہے۔ اعداد کے معاملے میں کتابت کی غلطیاں عام ہیں اسی "مقدمہ" میں (ص ۱۴) دیوان کے سب سے قدیم (آگرے والے) نسخے کی تاریخ تحریر سنہ ۱۱۸۰ھ درج ہو گئی ہے درانحالیکہ صحیح سنہ ۱۰۸۰ھ ہے۔ "اشارات" (ص ۴۹) میں یہی صحیح سنہ درج ہے، کتابت کی اس ایک غلطی کی وجہ سے "مقدمہ" میں اس نسخے کی تاریخی اہمیت نمایاں نہیں ہو پائی، کیوں کہ یہ اسی سال کا لکھا ہوا ہے جس سال مسلم نے دیوان غنی مرتب کیا تھا، اس غلطی پر تبصرہ نگار کی نظر بھی نہیں پڑی تھی، میں خود سے اس لئے ظاہر کر رہا ہوں کہ یہ وہ حاشیہ ہے جو السانی سہو و نسیان (بالخصوص کاتب) کے لئے چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ اگر مجھے خود پروف پڑھنے کو مل گیا ہوتا تو اس قسم کی فروگذاشتوں کا بر وقت ازالہ کیا جا سکتا تھا۔ ان فروگذاشتوں کو تضاد کا نام دینا بھول چوک کو ارادہ و عمد سے متہم کرنا ہے۔

فاضل تبصرہ نویس کے نزدیک ایک تضاد یہ بھی ہے کہ ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ "غنیؔ کی کوئی گھریلو زندگی نہیں تھی کیونکہ انھوں نے ساری عمر تجرد کے عالم میں گزاری" اور ذرا پہلے یہ لکھا ہے کہ "غنیؔ اپنے متوسلین اور اعزا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُن میں اکثر کی موت اُن کے سامنے ہوئی اور اس بات نے اُن کو زندہ درگور کر دیا"۔ میرے ناقص خیال میں اِن بیانات میں کوئی واقعاتی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کے لئے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ وہ خود تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے، مگر اُن کے بھائی اور دوسرے اعزا موجود تھے، جنھیں وہ عزیز رکھتے تھے بعض شاگردی کے واسطے سے بھی اُن سے توسّل رکھتے تھے، مہمان بھی اُن کے یہاں آتے رہتے تھے۔ متوسل یا عزیز کا غنیؔ کے گھر مستقل رہنا کہاں سے ضروری ہو گیا؟ اگر ضروری نہیں تھا تو تضاد کیسے پیدا ہو گیا؟ تجرد کے باوجود اعزا کو عزیز رکھا جا سکتا ہے! انصاری صاحب نے یہ تو لکھ دیا کہ "فاضل مقدمہ نگار کے اس مزعومہ کی حقیقت بس اتنی ہے کہ دیوانِ غنیؔ میں کسی خورشید کی وفات پر چند رباعیاں ہیں"، لیکن دیوان غنیؔ کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت یہ شعر کیسے اُن کی نظر سے بچ رہا؟ ؎

گشتیم زندہ در گور از بس دریں غم آباد　　کردیم خاک بر سر در ماتم عزیزاں

میرا بیان کچھ اس سے زیادہ مختلف تو نہیں تھا؟

خورشید کے بارے میں غنی نے جو رباعیاں کہی ہیں اُن میں سے ایک میں ارباب کمال کی ترکیب پر زور دیتے ہوئے تبصرہ نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "وہ کوئی صاحبِ کمال تھا" لیکن اوّلاً تو صاحبِ کمال ہونا، عزیز ہونے کے منافی نہیں ہے، دوسرے میں نے یہ خود لکھا تھا کہ "یہ صاف طور سے پتہ نہیں چلتا کہ خورشید کا غنی سے کیا رشتہ تھا، لیکن اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گیا تو وہ بہت ہی قریبی عزیز تھا یا ہونہار شاگرد"
تبصرہ نگار نے تو صرف ایک مصرعہ نقل کیا ہے۔ اب ذرا اس سلسلے کی رباعیاں دیکھئے:۔

ای درغمِ نور دیدہ چشمت نمناک یعقوب صفت، جامۂ صبرت صدچاک
درماتمِ فرزند مریز اشک بخاک صد طفل کمن، برای یک طفل ہلاک

از مردنِ خورشید جگرہا خون شد درد دلِ ماخستہ دلاں افزون شد
آسان نبود فراقِ اربابِ کمال خُم خانہ نشین درغمِ افلاطون شد

از مردنِ تو حاصلِ عمرم تباہ شد چیزی کہ صرفِ گریہ نشد خرج آہ شد
می آمدم کہ تنگ در آغوش گیرمت سنگِ سرِ مزار توام سنگِ راہ شد

چون درغمِ خورشید فغان بر خیزد ہرکس شنود از دل وجان بر خیزد
بر تربتِ او زدیدہ میریزم آب شاید کہ ازین خوابِ گران برخیزد

ایک طرف صرف 'ارباب' یا 'اسبابِ کمال' ہے اور دوسری طرف 'نور دیدہ' 'فرزند' 'طفل' اور 'حاصلِ عمر' مرنے والے کے لئے اور "یعقوب صفت" سوگوار کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ اِن سے کیسے نگاہیں پھیری جاسکتی ہیں؟ اِن کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد، میرے اخذ کردہ نتیجے کی تردید بے حد مشکل ہوگی۔

غنی کی شاعری کی ابتداء کے بارے میں سرخوش کا بیان بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ہے۔ اُس نے لفظ "غنی" کو ابتدائے شعرگوئی کی اخذِ تخلص کی تاریخ فرض کرکے یہ مفروضہ بنالیا ہے کہ غنی نے ۱۰۶۰ھ میں شاعری شروع کی۔ اور غنی تخلص اختیار کیا۔ صائب ۱۰۴۲ھ میں کشمیر آیا۔ اُس وقت غنی نہ صرف یہ کہ شاعری شروع کرچکے تھے بلکہ کشمیر کے نمایاں فارسی شاعروں میں شامل کئے جانے کے قابل ہوچکے تھے۔ قدیم وجدید، سبھی تذکرے اس پر گواہ ہیں، اخذِ تخلص کے سلسلے میں بھی میری تشریح درج مقدمہ ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ میں نے کسی ایسے تذکرہ نگار کا ذکر نہیں کیا ہے جس میں اس کا بیان ہو کہ صائب کو غنی نے اپنی بیاض دکھائی ہو، اگر ممدوح ایک بار میرے مقدمے کو پھر سے پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو انھیں اس ضمن میں "تذکرہ حسینی"، "نگارستان فارسی"، "تکملۃ الشعراء"، "مجمع النفائس" وغیرہ کا ذکر ملے گا۔ فرق اتنا ہے کہ یہ باتیں پہلے کہی جا چکی تھیں اس لئے دُہرائی نہیں گئیں، ان کے علاوہ بھی متعدد تذکروں میں ذکر موجود ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں اور ادبی مؤرخوں نے محمد علی ماہر کے شاگرد سرخوش کے بیان سے متاثر ہو کر یہ لکھ دیا ہے کہ ماہر نے غنی کا دیوان مرتب کیا تھا۔ ایو اور ایوناف مروّجہ دیوان (مرتبۂ مسلم) کے دیباچے کو بھی ماہر سے منسوب کرتے ہیں۔ اِن فہرست نگاروں کی غلطی اس لئے قابلِ گرفت ہے کہ وہ جن نسخوں کا ذکر کرتے ہیں خود اُن میں ماہر کا دیباچہ ندارد اور مسلم کا دیباچہ موجود ہے۔ مجھے اب تک غنی کے دیوان کا کوئی ایسا نسخہ نہیں مِلا جس کی ابتدا میں ماہر کا لکھا ہوا مقدمہ ہو یا کسی اور قرینے سے یہ قطعی طور پر ظاہر ہو سکے کہ ماہر کا مرتب کیا ہوا دیوان وہی ہے۔ سرخوش جو ماہر کا براہِ راست شاگرد ہے وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کے استاد نے دیوان مرتب کیا تھا۔ ایسی ہمعصر شہادت کو بھی صحیح باور کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ لیکن دیوانِ غنی، مرتبۂ ماہر، اب کہاں ہے، اس کا علم نہیں ہے۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) ایک تو یہ کہ یہ نسخہ اب نایاب ہی ہو اور (۲) دوسری یہ کہ کسی ایسے گوشے میں پڑا ہو جس کی ہمیں اطلاع نہ ہو۔ میں نے اسی لئے لکھا تھا کہ "ماہر کے دیوان کے نسخے اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں"۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ پھر نشاندہی کا سوال کیسے اُٹھتا ہے؟ اگر مجھے اپنی غیب دانی کا غرورِ باطل ہوتا تو اگر مگر کیوں کرتا؟ اپنے ناقص خیال میں، میں نے یہ جملہ بنظرِ احتیاط ہی لکھ دیا تھا، کیوں کہ جب تک کسی نے ہر ممکن گوشہ چھان نہ مارا ہو، "نایاب" کا فتویٰ لگانا، غلط ہوگا۔ اگر تبصرہ نگار جیسے صاحبِ نظر کو دھوکا ہوا تو یقیناً میرے جملے کی ناقص ساخت کا قصور ہے۔

میں نے لکھا ہے کہ مسلم نے چند اشعار جمع کرنے کے باوجود "دیوان میں غالباً اس لئے نہیں شامل کئے کہ وہ ہجو وغیرہ کو غنی کے شایانِ شان نہیں سمجھتا تھا"۔ مجھے حیرت ہے کہ تبصرہ نگار نے میری عبارت نقل کرتے وقت

"غالباً" کی اہم لفظ کیوں ہٹا دی اور میرے بیان میں شبہ کا جو انداز تھا، اُسے یقین سے کیوں بدل دیا۔ ایسے اشعار موجود تھے اُن سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مرتبہ دو (مین) میں بھی یہ عبارت ملتی ہے:-

"اشعار متفرقہ از قسمِ تواریخ و تعریفات و ہجویات وغیرہ کہ مسلم مغفور شاگردِ مصنفِ مبرور بعد جمعیت اشعار در آخر دیوان از تصنیف لطیفش درج ساختہ، درینجا بہماں ترتیبِ جامع بے تقدیم و تاخیر برای تفریح صغیر و کبیر بپایۂ تحریر می رسد" [1]

یہ اشعار مطبوعہ نسخوں میں اس تصریح کے ساتھ سب سے پہلے غالباً مطبع آصفی، کانپور کے نسخہ، مطبوعہ (۱۲۷۹ھ) میں درج ہوئے ہیں۔ دوسرے مشکوک اشعار جو مختلف نسخوں میں نظر آتے ہیں وہ بھی اگر بعد کے اضافے ہوں تو چنداں جائے تعجب نہیں ہے۔ خطی اور چاپی نسخوں میں اضافے اور ترمیمیں بار بار اور بے شمار ہوئی ہیں اور آج دیوان مرتبہ مسلم کی اصل بھی کثرتِ ترمیمات میں گم سی ہو گئی ہے۔ بہرحال، جن اشعار کو دریافت کرنے کے بعد بھی مسلم نے شاملِ دیوان نہیں کیا تھا اُن میں ایک تو وہی شعر ہے جسے انصاری صاحب قابلِ نقل بھی تصور نہیں کرتے۔ دوسرا شعر اس سے بھی شوخ تر انھیں اشعار میں ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ ع "ز شوخی پشت برمن الخ" میں بھی ان اشعار کو غنی کے شایانِ شان نہیں سمجھتا، مسلم تو اُن کا شاگرد ہی تھا۔ بعض غیر محتاط لمحوں میں ثقہ حضرات بھی نجی صحبتوں میں شوخ مزاجی کا ثبوت دے جاتے ہیں۔ یہ عام کرنے کی چیزیں نہیں بلکہ یہ وہ مستثنیات ہیں جن سے کلیہ ثابت ہوتا ہے۔ پھر زمانہ کے مذاق کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ عربوں اور ایرانیوں کے یہاں سرین کا شمار بھی آثارِ حُسن میں ہوتا تھا۔ ایسے اشعار عربی اور فارسی میں مل جاتے ہیں۔ آج ذہن خواہ مخواہ ذم کے پہلو کی طرف جاتا ہے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ہجو ملیح کبھی بُری نہیں سمجھی گئی۔ طغرا کے بارے میں غنی کی رباعی جواب الجواب کی حیثیت رکھتی ہے، جو لوگ غنی کے مزاج سے واقف ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ غنی سرقہ کے الزام پر برہم ہو جاتے تھے، اُن کی نثر اس کا ثبوت ہے۔ اس رباعی کے نقل کرنے سے غنی کی صفائی مقصود ہو سکتی ہے۔ اس کا بھی امکان قوی ہے کہ خود یہ رباعیاں بعد کا اضافہ ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے مسلم کے ارادے کے بارے میں جو شبہ ظاہر کیا ہے۔ وہ شبہ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو، لیکن اس صورتِ حال پر تضاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

---

[1] دیوان غنی (نول کشور، لکھنؤ، طبع نہم، ۱۹۳۱) ص ۱۳۲۔

بعض بیانات کو انصاری صاحب کے حوالے کا محتاج بتایا ہے۔ جو نتائج مختلف حقائق و قرائن پر مبنی ہوتے ہیں اُن کے لئے حوالہ دینا مشکل ہے نیات کو پورے بسط سے کہنا ہوگا۔ تبھی وضاحت ہو سکے گی۔ مقدمے میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ "ذکر و فکر غنی" میں تفصیلات موجود ہیں۔ غنی کے فضل و کمال کے بارے میں میرا مضمون "معارف" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیل کا محل نہیں۔ طب کی تعلیم اُس زمانہ میں رسمی طور پر بھی دی جاتی تھی۔ غنی نے اپنے ایک شعر میں بھی اشارہ کیا ہے :-

جو بیند دوای درد از من دگران لیکن الم من نہ پذیرد درمان

سماع کے بارے میں غنی کا شعر ہی موجود ہے :-

شب صدای گریہ اوجی داشت در بزم سماع چشم نَی کز اشک خالی بود در فریاد بود

لیکن کم ظرفوں کے لئے وہ اسے روا نہیں رکھتے تھے۔ وہی " یحل لاھلہ " والی بات :

نغمہ دل چون لبستند کم ظرفان وزین غافل کہ این می آخر از تندی کند سوراخ پیلو را

متن کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ متن بیشتر داراب کا مرتب کیا ہوا ہے۔ میرا حصہ اتنا ہے کہ جو نئے اشعار یا رباعیاں وغیرہ مجھے ملیں، وہ میں نے مناسب جگہوں پر اضافہ کر دیں۔ یہ خدمت میرے سپرد نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اپنی طرف سے یہ کام کیا کہ یہ نسخہ جہاں تک ممکن ہو مکمل ہو جائے۔ ایسے اضافوں کی نشاندہی میں نے حاشیوں میں کر دی ہے :-

موی میان تو شدہ کردہ جدا کاسۂ سر از تن

اس شعر کے بارے میں روایتوں کا طومار ضرور ملتا ہے۔ لیکن وہ سبھی روایتیں ضعیف معلوم ہوتی ہیں، اور میں نے "مقدمہ" میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے، دوسرے نسخوں کے متون میں بھی اس کا پتہ نہیں۔ ایسی صورت میں اس کو دیوان سے الگ رکھنا ہی مناسب تھا۔ ویسے بھی تذکروں سے متون کا انطباق نہیں کیا گیا ہے۔ خطی اور چھاپی نسخوں یا بیاضوں ہی پر بنیاد رکھی گئی ہے۔ داراب صاحب نے چند زبانی روایات اور "گلستانِ مسرت" پر اعتبار کیا ہے اور ایک شعر "غبارِ خاطر" سے بھی نقل کیا ہے۔۔۔ اس طریق کار کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن چونکہ حواشی میں حوالے دیدئے گئے ہیں، اس لئے غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ "غبارِ خاطر" والے شعر کے بارے میں

میں نے لکھ دیا تھا کہ یہ شعر مجھے "کلمات الشعراء" اور "دیوان غنی" میں نہیں ملا۔ اب مالک رام صاحب نے نشاندہی کی ہے کہ یہ شعر "کلمات الشعراء" میں غنیمت کے نام سے درج ہے۔ اور مولانا آزاد کو تسامح ہوا ہے اگر یہ بات پہلے ہی میرے علم میں آگئی ہوتی تو میں اسے ضرور خارج کر دیتا۔

فاضل تبصرہ نگار نے اپنے تبصرہ ("برہان" جون ۱۹۶۶ء؛ ص ۳۶۶، آخری سطر) میں لکھا ہے کہ "بقول محترم حاشیہ نگار "خیالِ غالب ہے کہ غنی نے یہ "شعر" بطورِ ضرب المثل کہا ہوگا۔" اصل عبارت یہ ہے "خیالِ غالب این است کہ غنی بطورِ ضرب المثل گفتہ باشد۔" نقل کرتے وقت تبصرہ نگار نے "یہ شعر" کا ٹکڑا اضافہ کرکے مضحکہ خیزی کا پہلو پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ واوین میں جو عبارت نقل کی جائے یا ترجمہ کی جائے اُسے بالکل ہی مطابقِ اصل ہونا چاہیے۔ مثل ہی مشہور ہے کہ "نقل را چہ عقل" جہاں نقل میں عقل شامل ہو جاتی ہے، وہاں اُلجھنیں بھی پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ شعر متنِ دیوان میں درج نہیں ہے۔ اور متن کے ذیل میں اس کا ذکر کرکے اس پر اعتراض کرنا بے محل بھی ہے۔ داراب نے اِسے ایک 'شعر' کی حیثیت دے کر شاملِ دیوان کر لیا تھا۔ میں نے اِسے متن سے خارج کرکے حاشیہ میں اس نوٹ کے ساتھ درج کر دیا کہ غالباً یہ 'ضرب المثل' ہے۔ اُسی کے بعد یہ بھی اضافہ کیا کہ 'چنداں قابلِ اعتنا نہیں ہے'۔ اگر میں اِسے شعر سمجھتا تو ضرب المثل ہوتے ہوئے بھی شاملِ دیوان رہنے دیتا، کیوں کہ بہت سے اشعار جو ضرب الامثال بن گئے ہیں، عام دوانین میں شامل ہیں۔ حاشیہ میں اس کا ذکر میں نے صرف اس لئے کر دیا کہ بہرحال یہ غنی سے منسوب ہیں اور چونکہ غنی کی نثر تک شامل کر لی گئی ہے، یہ ضرب المثل کیوں چھوڑ دی جائے؟

ترتیبِ دیوان کے وقت داراب کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ سارا کلام یکجا کر دیں جو غنی سے منسوب ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قوی اور ضعیف سبھی طرح کے "سہاروں" کی مدد لی ہے۔ "معمولی سہاروں" کی بناء پر اشعار کا دیوان میں شامل کرنا اُس وقت قابلِ اعتراض ہو سکتا تھا جب حواشی میں اِن سہاروں کی وضاحت نہ کر دی جاتی۔ دیوانِ غنی کے مرتبِ اول محسن نے بھی ایسے سہاروں کی مدد لی تھی اور اُس نے دیباچہ میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ جن لوگوں کے دیوان اُن کے مرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں، اُن کے لئے ایسے سہاروں کی مدد لینا ہی پڑتی ہے۔ ابھی حال میں پنڈت ہری چند اختر کے کلام کی تدوین کے سلسلے میں بھی یہی طریق کار اپنایا گیا ہے۔ "غیر معمولی سہارں"

کا حال یہ ہے کہ ایک قدیم مخطوط میں کلیم کی نو مستقل غزلیں غنی کے دیوان میں شامل ملیں۔ چونکہ رنگِ کلام سے شبہ ہوا، اس لیے معاصرین کے دیوان دیکھے گئے۔ اتفاق سے وہ سب غزلیں کلیم کے دیوان میں مل گئیں، اور موجودہ دیوانِ غنی میں شامل نہیں کی گئیں، اسی طرح بمبئی یونیورسٹی لائبریری کی فہرست میں ایک پورا "جنگ نامہ" غنی سے منسوب تھا۔ تحقیق سے کسی یوسف کا کلام نکلا۔ داراب نے اُسے شامل نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ تو "غیر معمولی" سہاروں کو آنکھیں بند کرکے قبول کر لینا چاہئے اور نہ معمولی سہاروں کو ٹھکرا دینا چاہیے۔ کوئی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہے۔ اگر حواشی میں نشاندہی کر دی گئی ہے تو آنے والے محققین گمراہ نہیں ہو سکتے۔

متن میں ایسی مثالیں ملیں گی کہ مصرعے آگے پیچھے ہو جانے سے، بعض اشعار کو متن کے مقاصد کے لئے الگ الگ درج کیا گیا ہے، اس کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں اس بات کا تعین ناممکن سا ہو جاتا ہے کہ شعر کی اصلی شکل کیا ہے۔ دوسرے جو لوگ کسی شعر کو کسی ایک ردیفِ خاص میں تلاش کریں تو انھیں مایوسی نہ ہو۔ آخر دواوین کی ردیف وار ترتیب کا مقصد بھی یہی ہے۔ غرض جہاں مصرعوں کا تقدم و تاخر ہو گیا ہے یا ردیف ہی بدل گئی ہے وہاں تکرار کا جواز موجود ہے۔ اکثر مقامات پر حواشی میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے کہ یہ شعر فلاں ردیف میں بھی درج ہے۔ کہیں کہیں ایسا نہیں ہو پایا ہے۔ یہ بھی ہوتا تو بہتر تھا۔

صفحہ ۱۳۵ والے شعر میں ظاہر ہے کہ کاتب سے سہو ہوا ہے۔ شعر یوں ہونا چاہئے تھا ؎

بسکہ در ہر گوشہ تخمِ خاکساری کاشتیم　　گرد باد از مزرعِ ما خوشہ چینی می کند

اس سلسلے میں فاضل تبصرہ نگار کا قیاس صحیح ہے۔

حضرت عثمان رضؓ کے سرکاری خطوط

مرتبہ و مترجمہ: ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب

شروع میں حضرت عثمانؓ کے حالات سے متعلق ایک بصیرت افروز تعارف، پھر خطوط کا ترجمہ اور آخر میں عربی کے اصل مکتوبات۔ صفحات ۲۰۶ بڑی تقطیع، قیمت ۴/ مجلد ۵/

مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی